جیلانی بانو کے ناول ایوان غزل کے کرداروں کا تجزیہ

اشتیاق احمد محمد اسحاق
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مہاراجہ سایاجی راؤ گائیکواڑ آرٹس، سائنس وکامرس کالج، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر۔ انڈیا

جیلانی بانو اردو کی ہمہ جہت ادیبہ ہیں۔ انہوں نے نثر کی تمام اصناف پر طبع آزمائی ہے اس کے علاوہ انہوں نے کتابوں پر تبصرے بھی کئے روزنامہ سیاست'' میں کالم شیشہ و تیشہ بھی لکھا ہے۔ مختلف اخبارات ورسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ یہ ملک و بیرون ملک کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ جیلانی بانو کے دو مشہور ناول ''ایوان غزل'' اور ''بارش سنگ'' ہیں۔ ان کا سب سے پہلا ناول ''ایوان غزل ہے جو ۱۹۷۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ انہوں نے ابتداء میں اس ناول کا نام ''عہد ستم'' رکھا تھا۔ ہندوستان اس وقت بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ عہد ستم'' نام سنسر کی زد میں آجانے کے خطرے کے پیش نظر ''ایوان غزل'' میں تبدیل کر دیا۔ جیلانی بانو نے ''ایوان غزل'' لکھ کر اردو ناولوں میں ایک اچھے ناول کا اضافہ کیا۔ اردو کے پسندیدہ ناولوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ 'ایوان غزل'' میں اپنے عہد کی بہتر انداز میں ترجمانی کی ہے۔ اس میں حیدرآباد کی جاگیرداری زندگی کی نزاعی کیفیت، کرب والم کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ''ایوان غزل'' میں ادبی تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ جشن قوالی کبھی غزلوں کی شامیں کبھی رقص کی محفلیں وغیرہ۔ واحد حسین موسیقی و رقص کے دلدادہ تھے۔ واحد حسین کے بیٹے ارشد حسین اور ان کی بیوی رضیہ کو ایک لڑکی تولد ہوتی ہے اس کا نام غزل رکھا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئین غزل ہے اور ایک اہم ترین کردار ہے غزل بچپن میں اسٹیج پر کام کرتی ہے۔ غزل کی زندگی میں کئی مرد آتے ہیں ہر دفعہ وہ دھوکہ دہی کا شکار ہوتی ہے۔ بلگرامی اپنی محبت کے جال میں غزل کو پھانستا ہے۔ نصیر منگنی کی انگوٹھی پہنا کر پاکستان چلا جاتا ہے۔ غزل بھی نصیر کو چاہنے لگتی ہے اور نصیر کا انتظار بھی کرتی ہے۔ ادبی تقریب میں مشہور و مقبول شاعر سرور جس نے مغرور حسیناؤں کو جھکایا تھا۔ غزل کی زندگی میں سرور آتا ہے لیکن غزل سرور کی دام محبت میں نہیں پھنستی ہے اور سرور کو غریبی کی وجہ سے ٹھکرا کر ایک ڈاکٹر سے شادی کر لیتی ہے۔ اُسی اثنا میں نصیر پاکستان سے آجاتا ہے اور اپنی منگنی کی انگوٹھی واپس لینے کے لئے غزل کے قریب آتا ہے اور غزل بھی نصیر کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نصیر جب انگوٹھی غزل سے واپس لے لیتا ہے یہ صدمہ غزل برداشت نہیں کر پائی اور غزل کی وفات ہو جاتی ہے۔ غزل کی وفات کے بعد نصیر کرانتی سے تعلقات بڑھاتا ہے لیکن کرانتی بہت ہوشیار لڑکی ہے نصیر کے جال میں نہیں پھنستی اور نصیر سے دور رہتی ہے۔ ایوان غزل میں غزل کی طرح بی بی کا کردار بھی اہمیت کا حاصل ہے۔ بی بی واحد حسین کی بیویوں میں سے ایک ہیں۔ بی بی کا کردار بغیر کسی تبصرے کے اس اقطباس سے ملاحظہ فرمائیے: ''پانچ ہزار کے نقد کے لالچ نے منشی صاحب کو پگھلا دیا۔ ایوان غزل کے سب سے بڑے ہال'' بہت الغزل'' میں بی بی دلہن بنی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔ جب چار مضبوط عورتوں نے مل کر نکاح کے اقرار کو ان کی گردن پکڑ کر بلائی تو وہ بے ہوش ہو گئیں اور ڈلہا کے بدلے سب سے پہلے ان کی صورت حکیم نے دیکھی۔ (جیلانی بانو ''ایوان غزل ص ۲۳ص ۳۳) بی بی بہت بھولی اور معصوم تھیں۔ دنیا سے بے خبر اپنا حق مانگنے کی پردہ نہیں۔ بی بی کے مزاج کو سمجھنے کے لئے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ ''بی بی بڑے ٹھنڈے خون کی تھیں اور تین برس گزرنے کے باوجود وہ اپنے کو ایوان غزل کی ملکہ کے بجائے ایک چپراسی کی لڑکی ہی سمجھتی ہیں۔ انہوں نے اپنے سارے اختیارات لنگڑی پھوپھو کو سونپ دیئے تھے اور خود سارے گھر کی ذمہ داریوں سے الگ تھلک بناؤ سنگار کے خوشبوؤں میں بسے چم چم کرتے کپڑے پہنے کلدیوں میں سنہرے نگوں کا جوڑا (جیلانی بانو'' ایوان غزل'' ص نمبر ۱۰۳) چمکاتی مسہری پر بیٹھی رہتی تھیں۔ یا پھر ناولیں پڑھنے میں وقت گزرتا۔

ماماؤں سے شہر کی اہم خبروں پر تبصرہ ہوتا۔ یا پھر پردہ لگی موٹر میں بیٹھ کر وہ رشتہ داروں کے ہاں ملنے چلی جاتیں۔ انھیں بالکل خبر نہ ہوئی کہ آج گھر میں امباڑے کی بھاجی پکی ہے یا پالک کی۔ واحد حسین کا کن کن چیزوں سے پرہیز ہے۔ البتہ واحد حسین کمرے میں آتے تو وہ نئی دلہن کی طرح سمٹ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کی ہر خواہش پر حکم کو بصد چشم قبول کرنے کو تیار۔ واحد حسین نے بھی بی بی کو اپنی ساری چابیاں سونپ دی تھیں۔ یہ وہ عورت تھی جس نے پچیس برس کی عمر میں پچیس عشق کرنے والے واحد حسین کو اپنے پاس بٹھایا تو پھر وہ کسی طرف نہ دیکھ سکے۔ مگر اس ڈیوڑھی میں لاکر تین بچوں کی ماں بنا کر بھی بی بی ان کے ہاتھوں نہیں آئی تھیں۔ (جیلانی بانو''ایوان غزل ص ۲۳ص ۳۳) ناول میں جاگیرداری ان ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ عورتیں کسی نہ کسی رُخ سے استحصال کا شکار ہیں اسی وجہ سے دبی دبی سی بغاوت کا جذبہ رکھتی ہیں۔ انہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ عورت کو وہ کچھ نہیں ملا جی کی وہ حقدار ہیں۔ ان کی زندگی بڑی حد تک گھریلو رہی ہے۔ الک طرف وہ ممتا بھری ماں ہیں تو دوسری طرف سگھڑ بیوی جو ہر دم شوہر کے آرام و آسائش کا خیال رکھتی ہیں۔ حویلیوں، محلوں، اور ایوانوں میں عورتوں کی زندگی ایک مخصوص دائرے کے گرد گھومتی ہے۔ جیلانی بانو کا دوسرا ناول''بارش سنگ'' ۱۹۸۴ء کراچی پاکستان سے اور ۱۹۸۵ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔''بارش سنگ'' کا سب سے پہلے مراٹھی میں ترجمہ کیا گیا اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالے''پنچ دھارا'' میں اسے قسط وار شائع کیا گیا۔''بارش سنگ'' کو انگریزی میں بھی ترجمہ کیا اور SternnessofHail نام سے دہلی سے شائع ہوا۔''پتھروں کی بارش'' کے نام سے ہندی میں ۱۹۸۷ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ جیلانی بانو کے ناولٹ کا مجموعہ''جگنو اور ستارے'' کے نام سے لاہوا سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں تین ناولٹ شامل ہیں۔ (۱) دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر (۲) جگنو اور ستارے (۳) رات جگنو اور ستارے کا ایک اور ایڈیشن پاکٹ بکس سائز میں شائع ہوا ہے اس ناولٹ میں صرف دو ناولٹ ہی یکجا ہیں (۱) رات اور (۲) جگنو اور ستارے۔ اس مجموعہ کو انہوں نے اپنی بڑی بہن''بوآپا'' کے نام معنون کیا ہے۔ جیلانی بانو کے دوسرا ناولٹ کا مجموعہ''نغمے کا سفر'' ہے۔ یہ ۱۹۷۷ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ ساہتیہ اکیڈیمی اور اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے مالی تعاون سے اردو مرکز حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو اتر پردیش اردو اکیڈیمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۷۸ء میں انعام سے نوازا۔ نغمے کے سفر کو جیلانی بانو نے اپنے شوہر ڈاکٹر انور معظم کے نام معنون کیا ہے اس مجموعے میں ان کے چار ناولٹ یکجا کئے گئے ہیں۔ (۱) اکیلا (۲) پتھر کا جگر (۳) کیمیائے دل اور (۴) نغمے کا سفر ناولٹ جگنو اور ستارے اور نغمے کا سفر کے علاوہ جیلانی بانو کے چند ناولٹ رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ جیسے''گڑیا کا گھر'' اور''ابارشن'' ناولٹ''گڑیا کا گھر'' پاکستانی رسالہ دوشیزہ میں نومبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۔

ناول "ایوان غزل" کے اہم کردار:

اردو فکشن کی دنیا میں جیلانی بانو کا نام نہایت ہی عزت و احترام کا حامل ہے۔ مصنفہ یوں تو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔''ایوان غزل'' ان کا ایک شاہکار ناول ہے جو (۱۹۸۵) میں شائع ہوا۔ اس ناول کا نام پہلی''عہد ستم'' تھا لیکن جس وقت یہ پریس میں تھا اس وقت ایمرجنسی کی وجہ سے کتابوں پر سنسرشپ عائد تھی اس لئے اس کا نام بدلنا پڑا اور یہ ناول''ایوان غزل'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ جیلانی بانو نے جس وقت اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا آخری زمانہ تھا۔ حیدرآباد کے جاگیردانہ معاشرے کی جگہ ایک نئی تہذیب پنپ رہی تھی۔ اس ناول میں انہوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد حیدرآباد کی سیاسی و سماجی تبدیلیوں اور بدلتی تہذیب و ثقافت کو موضوع بنایا ہے۔''ایوان غزل'' کی تخلیق کے متعلق لکھتی ہیں۔:

اس ناول کو میں نے ایک شدید کرب جیسی کیفیت سے شروع کیا تھا کیوں کے اس کا موضوع میرے ذہن پر ایک بوجھ بنا رکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس بکھرتے ٹوٹتے حیدرآباد کا سارا درد کسی طرح اپنی تحریر میں سمیٹ لوں تاکہ یہ ایک خواب کی طرح دماغ سے محو نہ ہو جائے اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتی تھی کہ ایک مخصوص تہذیب کی زوال پذیر ہونے کے جو محرکات تھے ان کو محسوس کروں۔ اس لیے مجھے ان بدلتے ہوئے حالات کے عوامل تلاش کرنے تھے اور اس اخلاقی اور معاشی زوال کے اسباب بھی دیکھنے تھے جو حیدرآباد کی سماجی زندگی میں شروع ہوئے تھے۔ اس لئے مجھے ناول میں ماضی کو پیش کرنا پڑا تاکہ میں ماضی کے

سہارے حال اور مستقبل کے امکانات کو موضوع بنا سکوں۔''

''ایوان غزل'' ایک ایسا ناول ہے جس میں جیلانی بانو نے احمد حسین اور واحد حسین کے زوال آمادہ خاندان کی تصویر کو ہمارے روبرو کیا ہے۔اس ناول میں محمد حسین اپنی اہلیہ، بی بی ،لنگڑی بہن گوہر اور بیٹے راشد اور اس کی بیوی رضیہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ان کی دونوں بہنیں بشیر بیگم اور بتول بیگم کی شادی مختلف رنگ ڈھنگ کے گھرانے میں ہوتی ہے۔ایک قدیم خیالات کے پروردہ تو دوسرے نہایت موڈرن ٹائپ۔بشیر بیگم کے شوہر حیدر علی خاں جو ترقی پسند خیالات کے حامل ہیں جب کہ بتول بیگم کے سسر اللہ والے ہیں اور ان کے شوہر ہمایوں بھی کچھ عجیب ہیں۔اس ناول میں مرکزی کردار چاند اور غزل کے ہیں۔چاند حیدر علی خاں کی بیٹی ہے اور غزل بتول بیگم کی بیٹی ہے جو اس ناول کی اصل ہیروئن ہے۔جیلانی بانو کے اس ناول میں بہت سے کردار ہیں جو الگ الگ عمر کے اور الگ الگ طبقوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

چاند اور غزل نہایت ہی حسین و جمیل لڑکیاں ہیں۔چاند جو ایک طرف اپنے نانا نانی سے زیادہ اپنے ماموں راشد کی آنکھوں کا تارہ اور اپنی ممانی رضیہ کی دلاری اور دوسری طرف حیدر خاں کی محبت و شفقت کا محور اس کی پرورش ایک آزادانہ ماحول میں ہوتی ہے کیونکہ اس کے والد ایک ترقی پسند خیالات کے حامی ہیں۔لیکن چاند کی فیشن پرستی نانا واحد حسین کو بالکل پسند نہیں۔لیکن وہ اپنی عمر کے ایسے پڑاؤ میں داخل ہو چکے ہیں کہ جہاں ان کے لیے اپنی بات منوانے کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ بس اس منظر کے تماشائی بنے رہتے ہیں۔اپنے سے زیادہ چاند اپنے ماموں راشد کی شفقت کا مرکز بنتی ہے۔راشد جو خود زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہے۔اور نئی منزل کی تلاش کر رہا ہے۔وہ چاند کی خوبصورتی کو اپنے بزنس کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔وہاں اس کے لیے چاند ایک مفید ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔:

؛وہ (راشد) بزنس کے اصول پڑھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ چاند جیسی تہذیب یافتہ اور فیشن ایبل لڑکیوں کا بھاؤ کتنا بڑھا ہوا ہے۔
اتنا کہ لوگ چاہیں تو ان کے سہارے لاکھوں کا کنڑیکٹ لے لیں۔''

''چاند کی اس خوبصورتی کے بدولت راشد کے بہت سے بگڑے کام سنور گئے تھے کیوں کہ وہ چاند جیسی خوبصورت لڑکی کا ماموں تھا۔بڑے بڑے سرکاری فنکشنوں میں اس کا پروگرام ہوتا تھا۔کالج کے ہر ڈرامے کی ہیروئن وہی ہوتی۔اخبار اس کے آرٹ پر مضامین لکھتے تھے۔اس طرح اونچے اونچے طبقے میں وہ خود پہنچ گئی تھی بلکہ اس نے راشد کو بھی پہنچا دیا تھا۔''

چاند کی زندگی میں ایک اہم موڑ سنجیوا سے ملاقات کے بعد آتا ہے۔جس کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ اپنا جسم ہی نہیں بلکہ اپنی روح کی ساری عفت نچھاور کر دیتی ہے۔حیدر علی خاں جب اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں تو اپنی خیریت کہلوانے کے لیے سنجیوا کو چاند کے پاس بھیجتے ہیں۔سنجیوا سے چاند کی پہلی ملاقات کا منظر دیکھیے۔:

''خط پڑھ کر چاند نے نظریں اٹھائیں تو گھبرا گئی۔وہ سیام فام نوجوان اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا چند سیکنڈ کے بعد چاند نے گھبرا کر پوچھا۔۔۔بابا آج کل کہاں ہیں۔؟:بہت دور؛اس نے اسی محویت کے عالم میں جواب دیا کیا آپ بھی بابا کے ساتھی ہیں؟؛ہاں میں ایک مجسمہ ساز ہوں۔اپنا کام چھوڑ کر پارٹی میں شریک ہو گیا ہوں؛لیکن ابھی آپ کو دیکھ کر خیال آیا کہ مجھے اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہئے''
کیوں، چاند ہنس پڑی۔اجنبیوں سے خوش اخلاقی برتنے میں وہ ماہر تھی۔
''کیونکہ مجھے غافل پا کر خدا مجسمہ سازی کے فن میں بہت ترقی کر رہا ہے وہ آپ جیسی حسین شبیہ بنانے لگا۔''

یہ کمیونسٹ ورکر سنجیوا بھی کچھ عجیب و غریب قسم کا انسان تھا۔وہ چاند کی خوبصورتی میں مدہوش ہونے کے باجود اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کر سکا کیونکہ یہ ایک الگ سوچ رکھنے والا انسان تھا۔اس کے لئے اپنے سیاسی مفید کے حصول کے پیش نظر جسمانی قربت کہ بہ نسبت ذہنی ہمدردی اور وابستگی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔اس کا مقصد تھا غیر طبقاتی ریاست کا قیام اور جاگیردارانہ قسم کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔چاند سنجیوا میں کشش محسوس کرنے کے باوجود اسے اپنے لئے تیار نہ کر سکی

کہ وہ اسے اپنا ہمسفر بنالے۔اور سنجیوا اسے اپنے مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ سمجھ کر ٹھکرا دیتا ہے۔اور پھر وہ واحد حسین کی ناجائز اولاد فاطمہ بیگم کی بیٹی قیصر سے شادی کر لیتا ہے۔قیصر اور سنجیوا کے مزاج میں ایک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے کیونکہ وہ معاشرے کے استحصال کا شکار نہیں ہوتی اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ان وجوہات کے پیش نظر قیصر جب ایک بچی کو جنم دیتی ہے جس کا نام کرانتی ہے تو وہ خود اسے چاند کے سپرد کر آتی ہے کیونکہ سنجیوا اور قیصر کے سر پر ہمیشہ موت کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔اور بلآخر قیصر کو بغاوت کے الزام میں پھانسی بھی ہو جاتی ہے۔اور وہ بلا جھجھک موت کو گلے لگا لیتی ہے۔کیونکہ وہ چاند اور غزل کی طرح معاشرے کے استحصال کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ایک جگہ وہ غزل سے کہتی ہے۔:

''رونا چھوڑو غزل۔بلکہ اپنی روش بدلو؛ قیصر نے اسے گلے لگا کر کہا؛ چاند کی طرح مردوں سے کھیلنا چھوڑ دو جسم کے علاوہ دماغ بھی تو ہے تمہارے پاس وہ کیوں نہیں پہنچتی''۔

قیصر کا کردار اس ناول میں مختصر سا ہے لیکن بہت جاندار ہے۔وہ نہ صرف دل و دماغ سے سوچتی ہے بلکہ حالات کو بدلنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ادھر چاند سنجیوا کی بے رخی کی وجہ سے ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔لیکن وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک سنجیوا کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے کیونکہ سنجیوا سے اس کا رشتہ جسم سے زیادہ روح کا تھا۔ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد وہ کسی کام کی نہیں رہتی اس لیے اس کا ماموں راشد اور ممانی رضیہ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور آخر کار چاند سنجیوا کی بیٹی کرانتی کو گلے لگا کر مر جاتی ہے۔چاند کا کردار اس ناول میں بڑے ہی دلکش طریقے سے پیش کیا گیا ہے جو دو تہذیبوں کے درمیان مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔چاند کی موت پر غزل کے احساسات ملاحظہ کیجیے۔جو اسے اپنے لیے ایک قابل تقلید نمونہ تصور کرتی تھی۔

''غزل کو یوں لگا جیسے اس کی ماں آج پھر مر گئی ہو۔چاند آپا کو اس نے سب سے زیادہ چاہا تھا وہ اس کا سورج تھیں۔اس کی زندگی اس وقت چاند کے چہرے پر اس کی وہ مشہور روایتی خوبصورتی پھر لوٹ آئی تھی جس نے اسے سارے حیدرآباد میں مشہور کر دیا تھا۔اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر پندرہ سولہ برس والی لڑکیوں کی معصومیت اور شادابی تھی۔اس کے گلابی ہونٹ کنول کی کچی کلیوں کی طرح پاک لگ رہے تھے۔اور اس کے نازک بدن پر کنوارے پن کا نکھار تھا۔سفید کفن میں اس کے سیاہ بالوں کی لہرے دار لٹیں کانپ کر اس کی زندگی کا یقین دلا رہی تھیں۔اور غزل سوچ رہی تھی اس موہنی صورت کو لوگ کیسے مٹی میں ملا دیتے ہیں''۔

غزل کا کردار چاند کی بہ نسبت زیادہ پیچیدہ اور مبہم ہے۔چونکہ غزل کا بچپن چاند کے برعکس فرسودہ ماحول میں گزرتا ہے۔اور اس کا تعلق بیک وقت الف لیلی اور ایوان غزل کے ماحول سے بھی رہا ہے۔لیکن دونوں ہی جگہ اس کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں رہی جہاں وہ ایک طرف اپنی ماں کی بے وقت موت کا صدمہ لیے پھر تی ہے وہیں باپ کی بے حسی اور نفرت کا شکار ہے اور اس کے ماموں راشد کا ایک ناپاک ذہن ہے جو اسے ذخیرہ اندوزی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ایک مرتبہ چاند نے غزل کو نصیحت کرتے ہوئے بہت سہی بات کہی تھی۔

''میں تو صرف چھبیس برس میں موت کے کنارے کھڑی ہوں لیکن غزل تو خود چلنا چھوڑ دے۔اپنی تقدیر خود بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا اس لیے اپنی باگیں بی بی کے ہاتھ میں تھمادے ورنہ راشد ماموں اور خالو پاشا تجھ سے اپنی کامیابیوں کی نقل کھولیں گے اور تجھے پھینک دیں گی''

راشد اپنی بیٹی فوزیہ اور شاہین کے ذہن میں بھی غزل کے لیے نفرت پیدا کرتا ہے۔غزل اپنے ماموں زاد بھائی بہن کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔چونکہ وہ بچپن سے ہی محبت کی بھوکی رہتی ہے۔اس لیے وہ جذباتی اور ذہنی طور پر بکھر جاتی ہے اور جیلانی بانو کے الفاظ میں:۔

''لیمو اور مٹھائی کھاتے دیکھ کر تو سب ہی کے منھ مین پانی آتا ہے مگر کسی بچے کو اس کی ماں سے پیار کرتے دیکھ کر جیسے بھوک بھڑک اٹھتی ہے''

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل محبت کی کتنی پیاسی ہے۔ایسے میں جہاں کوئی اس سے دو چار میٹھے بول بولتا وہ فوراً پگھل جاتی اور محبت کے جھوٹے وعدوں پر ایمان لے آتی۔جیلانی بانو لکھتی ہیں:۔

''وہ اپنی جانب محبت سے دیکھنے والی نگاہ پر سات خون معاف کر دیتی تھی کیونکہ ایسی نگاہیں بہت کم ملتی تھیں''

اور سب سے پہلے وہ بھان صاحب کی تیکھی نظر کا شکار بنتی ہے۔اور وہ اس پر عنایتوں کی بارش کرنے لگتا ہے۔جس طرح اس نے چاند کو نشانہ بنایا

تھا۔ چاند کے لیے اس نے راشد کی وساطت کا راستہ ڈھونڈا تھا اور غزل کے لیے وہ ہمایوں کی غربت سے فائدہ اٹھا کر غزل کو اپنے لیے وقف کر لیتا ہے۔ اس ڈرامے کے بیچ بلگرامی کی آمد ہوتی ہے۔ جو انتہائی خوب رو قسم کا نوجوان تھا۔ اور جب وہ غزل سے کہتا ہے کہ وہ اس کی خاطر یہاں آیا ہے تو غزل سوچتی ہے۔

’’میری خاطر، میری خاطر، میرے لیے یہ اتنا خوبصورت آدمی، اتنا بڑا آدمی، اتنا مشہور، اس کی ہر ادا پر چاند سے لے کر رضیہ ممانی تک مرتی تھیں۔ اس کے پیچھے عورتیں آٹو گراف بک لے کر پھرتیں۔ یہ خوبصورت شہزادوں کی صورت میرے لئے۔ یا اللہ آج کیا ہو رہا ہے کہیں میں مر نہ جاؤں۔ بلگرامی کا وہ جملہ جانے کتنے رنگوں میں ڈوب کر جانے کتنے چاند بن کر چمکا۔ بارش بن کر آسمان سے آیا اور غزل کے سارے وجود کو سرشار کر گیا اب کیا رکھا تھا اس میں جو وہ اس میں سینت کر رکھتی۔‘‘

لیکن یہاں بھی غزل کو دھوکہ ہوتا ہے بلگرامی اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس سے شادی کرنے کے جھوٹے وعدے کرتا ہے اور ایک دن وہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ان سب واقعات کے پیش نظر جیلانی بانو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ کس طرح معاشرے میں عورتوں کے ساتھ استحصال کیا جاتا تھا اور مرد انہیں محض جنسی عیاشی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس معاشرے میں غیر عورتوں سے تعلق رکھنا ایک عام بات تھی۔ جیلانی بانو لکھتی ہیں:

’’اس وقت قاعدہ تھا کہ سب ہی نواب دل بہلانے خوبصورت لڑکیوں کو محل میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ لڑکیاں غریب ماں باپ کے یہاں فاقے کرتیں یا کسی نکمے جاہل آدمی سے بیاہی جاتیں تھیں۔ لیکن محلوں میں انہیں شاندار گھر ملتے ان کے نام پر جاگیریں ہوتیں۔ ان کی اولاد کا مستقبل درخشاں ہو جاتا تھا۔ ان کے ماں باپ الگ بخشش سے قسمت سنوار لیتے تھے مگر پھر بھی دنیا میں روتے پھرتے کہ ان کی لڑکیوں کو زبردستی نواب لوگ اٹھا لیتے ہیں۔‘‘

اس اقتباس کی روشنی میں جیلانی بانو نے سماج کے اس دوغلے پن کو بھی بے نقاب کیا ہے جو اپنی بیٹیوں کا سودا کر کے عیش کرتے تھے اور دوسری طرف سماج کی بری نظروں سے بچنے کے لیے جھوٹا رونا روتے۔ یہاں غزل بھی اپنے باپ کی اس وحشیانہ حرکت کا شکار ہے۔

کچھ عرصے کے لیے غزل راجہ شیوراج اور خورشید آپا کا سہارا ڈھونڈتی ہے لیکن زندگی کے اس نشیب و فراز میں وہ اور بھی الجھتی جاتی ہے۔ اور ایک دن خورشید آپا جو نہایت ہی منہ پھٹ اور بے شرم قسم کی ہیں اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے: ۔ ریڈیو ڈرامے میں بڑے ٹھٹے کے ساتھ کام کرتیں کیا مجال کہ ریہرسل کے وقت کوئی ڈائریکٹر کا بچہ چوں بول جائے۔ ایسی فحش گالیوں کی بوچھار کرتیں کہ ڈھیٹ سے ڈھیٹ مرد بھی شرما جائیں۔‘‘

وہ غزل سے کہتی ہیں:

’’راجہ شیوراج ہے نا وہ تم پر بری طرح مرتا ہے کئی بار میرے پاس آیا مگر تم بلگرامی کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی غزل جھینپ گئی۔‘‘

اپنے مسحور کن حسن کی تعریفیں سن کر پگھل جانے والی یہ غزل راجہ شیوراج کی پیاس کا شکار نہ ہو پائی کیونکہ وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ شیوراج کے ہاتھوں اپنی تذلیل کے بعد غزل کی ملاقات سرور سے ہوتی ہے جو حامد میاں کی بیوی کا سگا بھائی اور حیدر آباد کا ایک مشہور شاعر ہے۔ یہ مرد کچھ الگ خیالات کا تھا۔ اور ذہن و دل سے پاک و صاف ہے۔ وہ غزل کے ساتھ ہوئے تمام واقعات سے باخبر ہونے کے باوجود اسے اپنے تخیل کی وادیوں کی سیر کرانا چاہتا ہے اور اپنے شعری وجود کو اس میں تحلیل کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن غزل کے ذہن میں اس وقت کچھ اور خیالات منڈلا رہے تھے۔ اس کی اس پیشکش پر چونک پڑتی ہے۔

وہ غزل کے سارے آنسو سب سسکیاں اپنے رومال میں سمیٹ کر چلا گیا۔ پلنگ پر سونے لیٹی تو غزل نے سوچا وہ بائیس تیئیس برس کا ہوگا۔

مگر اس کا انداز کیا ہے جیسے وہ بڑائی کے قطب مینار پر کھڑا ہے۔ یہ کیسا انوکھا مرد تھا غزل نے آج پہلی بار ایک اجنبی مرد ایسا دیکھا تھا جو اس کی جوانی کو بالکل راشد ماموں کی طرح نظر انداز کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے دیکھتے ہی مرد اپنی عقل اور صبر دونوں کھو بیٹھتے تھے۔‘‘

لیکن غزل اس مرد کی شرافت پسندی کو دیکھ کر تذبذب میں پڑی ہوئی تھی وہ اس پر شک کرتی ہے کہ کہیں اس کے اندر بھی وہی وحشیانہ حرکت تو نہیں پوشیدہ ہے جس کا تجربہ اس سے پہلے اسے بارہا ہو چکا تھا۔ وہ امید کرتی ہے کہ سرور اسے اپنی آغوش میں آنے کی دعوت دے گا۔ اور اسے اپنی خوشیوں میں شریک کرے گا۔ لیکن وہ اسے اپنی تخیلی کائنات کے آب و رنگ اور تب و تاب کا واسطہ دینے لگا۔

’’میں جانتا ہوں کہ کہ تمہیں مردوں نے اتنے دھوکے دیے ہیں کہ اب تمہیں کسی پر اعتبار نہیں رہا لیکن میری شاعری میں تم ہمیشہ زندہ۔‘‘

سرور کے ان پاکیزہ جملوں، سادگی، شرافت، اور جذبہ ایثار میں اسے ایک تصنع نظر آنے لگا۔ اور اس طرح غزل نجات کے دروازے سے واپس لوٹ آتی ہے۔ جان صاحب، بلگرامی، شیوراج اور سرور کے بعد غزل کی ملاقات نصیر سے ہوتی ہے جب وہ حیدرآباد میں اپنے چچا واحد حسین کے یہاں فوزیہ کی منگنی میں شرکت کرتا ہے۔ غزل کو دیکھ کر نصیر کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اور اسے حاصل کرنے کے لیے اپنے جال بننے شروع کر دیتا ہے جیسے بھان اور بلگرامی نے بنے تھے۔ بھلا غزل ایسے جال سے بچ کر کہاں بھاگ سکتی تھی۔ نصیر اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کی خاطر اسے باقاعدہ رشتۂ ازدواج کا جھوٹا وعدہ کرتا ہے اور غزل اسے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے۔

''نصیر کے پیار کی گرمی اس کے لیے بہت پرانی سی بات ہو چکی تھی وہ بالکل گرہست بیویوں کے انداز میں اپنا آپ اس کے حوالے کر دیتی تھی۔ اس نے تو اپنی روح پہلی بار ایک مرد کو سونپی تھی اور اس کے بعد ہر چیز بھول جانا چاہتی تھی۔''

لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی غزل کو دھوکہ ہوتا ہے اور ایک بار پھر وہ بدنصیبی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈھکیل دی جاتی ہے۔ اور یہاں اس کے جسم کے ساتھ روح کو بھی دھوکہ ہوتا ہے۔ کیونکہ نصیر ہی وہ شخص تھا جس میں غزل کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے امکانات نظر آ رہے تھے۔ نصیر سے جدائی کے بعد ایک بار پھر وہ تنہائی کا شکا ہو جاتی ہے۔ اور جب فوزیہ نکاح کے وقت روتی ہے تو غزل سوچتی ہے؛

''پاگل میں ہوتی تو اسی خوشی کے مارے مر جاتی کسی ایک کی ہو کر مر جانے کا سکھ کیسا ہوتا ہوگا! مجھے فوزیہ کی زندگی کا ایک ہی لمحہ مل جائے تو۔''

غزل چاہتی تھی کہ اسے بھی کسی کا پرخلوص پیار ملے۔ لیکن پیار اور محبت کے نام پر اسے صرف دھوکے ہی ملتے ہیں۔ وہ مردوں کے لئے ایک کھلونا بن کر رہ جاتی ہے کہ جب جی چاہا کھیلا اور پھر اسے پھینک دیا۔ مردوں کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے نے غزل کو اس طرح مجبور کر دیا تھا کہ اس کا مردوں پر سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔ اس لیے جب اس کا ماموں زاد بھائی شاہین اس سے شادی کرنے کو راضی ہوتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ غزل ننہال اور ددھیہال دونوں جگہ احساس کمتری کا شکار ہوتی ہے، اس لیے شادی کے بعد بھی اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ وہ سوچتی ہے، کہ اوروں کی طرح جسم کا مطالبہ ہی اسے شاہین تک لایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاہین اسے ایک بیوی کی حیثیت سے اپنی زندگی میں درجہ دینے کے لیے تیار نہ تھا وہ اسے صرف ایک بازاری عورت تصور کرتا ہے۔ غزل کی اس نفسیاتی کیفیت کی جھلک درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

''اور اس عقد مسعود کی رات غزل بار بار سوچ رہی تھی کہ لڑکیاں کتنی جھوٹ بولتی ہیں اس وقت کے بارے میں۔ مجھے تو شہنائی کے سروں میں کوئی نشہ گھلتا نہیں لگ رہا ہے، نہ تو چند تارے کہیں جھلک رہے ہیں اور نہ میرے دل میں کہیں کلیاں لہک رہی ہیں۔ ایوان غزل کی ساری اداسی اور مایوسی کا اندھیرا میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ گھبرا کر وہ نصیر والی ہیرے کی انگوٹھی کو بار بار اتارتی پھر پہن لیتی۔ تب شاہین اس کے پاس آیا اور اس کی ٹھوڑی اٹھا کر بولا غزل اب ڈرنا چھوڑ دو۔۔۔۔۔سوچنا چھوڑ دو۔۔۔آج سے وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔۔۔۔نہیں نہیں وہ چلا کر رو پڑی۔''

شاہین اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ ہر بات اس سے پوچھ کر کرتا ہے۔ مگر غزل جس کی محبت کو آج تک سارے مرد ٹھکراتے آ رہے تھے وہ بھا اتنی محبت کہاں سینت کر رکھتی۔ اسے شاہین کی ہر ادا میں مصنوعی پن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور اسے لگتا ہے کہ شاہین وہ مرد نہیں جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ شاہین کو بس فرض سمجھ کر نپٹاتی ہے۔ ادھر نصیر نے پاکستان جا کر نفیس بیگم سے شادی کر لی تھی۔ اور عیش و آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ ہندوستان آتا ہے اور پھر حیدرآباد پہنچتا ہے۔ غزل اور نصیر کچھ دنوں تک ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ لیکن انتہائی خطرناک موڑ اس وقت آتا ہے جب نصیر تنہائی میں موقعہ پا کر غزل کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

''جانے کتنی کوششوں کے بعد نفیس اور شاہین سے بچ کر وہ یہاں آیا تھا۔ آج پورے دس برس کے بعد نصیر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے نفیس اور شاہین بھی یاد نہیں آ رہے تھے۔ نصیر اس کے اور قریب آ گیا اتنے قریب کہ اس سے وہ بے اختیار لپٹ گئی۔ مگر نصیر نے اپنی کمر سے اس کا ہاتھ نکال کر تھاما، غزل یہ انگوٹھی مجھے دیدو اماجان کہتی تھیں کہ یہ انگوٹھی نفیس کو پہننا چاہئے۔''

اورآخرکار برسوں سے پڑی اس کی انگلی میں یہ انگوٹھی نصیرا تار لیتا ہے۔غزل اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی ہے۔اوراس طرح محروم حسرت وویاس سے بھری ایک تشنہ زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔جیلانی بانو نے غزل کو ناول کے مرکزی کردار کے طور پر پیش کر کے ایک خاص عہد اور طبقے کی تمام خرابیوں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ساتھ ہی آزادی اورانقلاب کی جو تحریکیں پنپ رہی تھیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔

ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے۔واحد حسین سے لیکر کرانتی تک ہر کردار اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے اور ناول کے موضوع اوراس کی رفتار کو آے بڑھاتا ہے۔یہاں ایاز اور شہزاد بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور فاطمہ کے شوہر غلام رسول بھی، یہاں سایا اور مس ریڈی بھی اہم ہیں اور بی بی بھی۔لیکن جیلانی بانو نے چاند اور غزل کے کردار کے ذریعہ ایک بدلتے ہوئے سماج کی تصویر کشی بڑی خوبی کے ساتھ پیش کی ہے۔ جیلانی بانو نے ان تمام کرداروں کے ذریعہ معاشرے کے باریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔اس لیے ایوان غزل؛ کا قصہ روایتی ہونے کے باوجود دلچسپی اور دلکشی کے خاصے عناصر رکھتا ہے۔

☆☆☆